ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2912

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ — شعبہ حدیث وعلوم حدیث

کورس: لغۃ الحدیث (2912) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی نقطہ نمبر 1

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: عربی رسم الخط پر مختصر نوٹ

سوال نمبر 1: عربی رسم الخط پر مختصر نوٹ لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

رسم الخط سے مراد کسی زبان کو لکھنے کا وہ طے شدہ طریقہ اور ضابطہ ہے جس کے مطابق حروف کو جوڑ کر الفاظ بنائے جاتے ہیں، یعنی املا اور کتابت کے اصول۔ عربی رسم الخط دنیا کے قدیم اور پائیدار ترین رسومِ خط میں سے ہے، جس میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ سمیت صدیوں کا عظیم علمی و ادبی سرمایہ محفوظ ہوا۔ لغت الحدیث کے طالب علم کے لیے عربی رسم الخط سے واقفیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ احادیث کی قدیم کتابیں اسی رسم الخط کی ارتقائی صورتوں میں لکھی گئیں، اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں موجود قواعد، خصوصاً مصحفی املا کی خصوصیات، اسی تاریخ کی دین ہیں۔ ذیل میں عربی رسم الخط کا مفہوم، اس کی ابتدا اور ارتقا، اس کی بنیادی خصوصیات اور اس کی اہمیت پر مختصر نوٹ پیش کیا جاتا ہے۔

رسم الخط کا مفہوم اور عربی خط کی ابتدا

لغت میں رسم کے معنی نقش، نشان اور طریقے کے ہیں، اور اصطلاح میں رسم الخط سے مراد حروفِ تہجی کو لکھنے کی وہ صورت و ہیئت ہے جو کسی قوم میں رائج ہو جائے۔ عربی خط کی ابتدا کے بارے میں اہلِ تحقیق کی مشہور رائے یہ ہے کہ عربوں نے کتابت شمالی عرب کے ان تجارتی و ثقافتی مراکز سے سیکھی جو شام و عراق سے جڑے ہوئے تھے، اور عربی خط اپنے ارتقائی مراحل میں نبطی خط سے نشو و نما پا کر مستقل صورت اختیار کر گیا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے مکہ اور مدینہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج محدود تھا، مگر خط موجود ضرور تھا؛ معلقات کے مکتوب ہونے، صلح حدیبیہ کے معاہدے کے تحریر میں آنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلاطین و امرا کے نام خطوط بھیجنے کے واقعات اسی کی دلیل ہیں۔ نبوی عہد میں وحی کی کتابت کے لیے کاتبینِ وحی کی جماعت مقرر ہوئی جن میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نمایاں ہیں، یوں عربی رسم الخط کو سب سے مقدس اور محفوظ متن کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔

عربی رسم الخط کے ارتقائی مراحل

ابتدائی عربی خط کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہ نقطے تھے اور نہ اعراب، اور ایک ہی شکل والے حروف باہم مشابہ ہوتے تھے، اس لیے پڑھنے کے لیے قاری کی زبان دانی، سیاق و سباق اور سماعی اعتماد ناگزیر تھا۔ خلافتِ راشدہ میں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف مرتب کر کے امصار کو بھیجے تو قرآن کا ایک سرکاری رسم قائم ہوا جسے بعد میں رسمِ عثمانی یا مصحفی رسم کہا گیا، اور اسی رسم کی املائی خصوصیات آج بھی مصاحف میں محفوظ ہیں، مثلاً بعض الفاظ میں حروف کا اضافہ یا حذف اسی مصحفی قواعد کے مطابق رہا۔ پھر جب اسلام عرب سے باہر پھیلا اور عجمی مسلمان قرآن و حدیث پڑھنے لگے تو لحن اور غلط خوانی کا خطرہ پیدا ہوا، چنانچہ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ابو الاسود دؤلی نے اعراب یعنی حرکات کی بنیاد رکھی اور بعد میں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے حروف پر نقطے لگانے کا نظام وضع کیا تاکہ با، تا، ثا جیسی مشابہ شکلیں ممتاز ہو سکیں۔ خلیل بن احمد فراہیدی نے اعراب کی موجودہ شکلیں یعنی زبر، زیر، پیش اور دیگر علامات کو مرتب صورت دی۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں خط کی دو بڑی روشن صورتیں سامنے آئیں: خطِ کوفی جو جلی، سہ زاویہ اور تزئینی تھا اور مصاحف و عمارتوں میں استعمال ہوتا تھا، اور خطِ نسخ جو گولائی لیے ہوئے، رواں اور کتابوں کی کتابت کے لیے موزوں تھا۔ ابن مقلہ اور ابن بواب جیسے خطاطوں نے خط کو مقررہ تناسبات اور باقاعدہ اصولوں میں ڈھالا، اور بعد کے ادوار میں ثلث، دیوانی، رقعہ اور فارسی طرز میں نستعلیق جیسی صورتیں پیدا ہوئیں، جبکہ عربی کا بنیادی نسخ آج بھی کتابی خط کے طور پر دنیا بھر میں رائج ہے۔



شکل 1: عربی رسم الخط کے ارتقائی مراحل

عربی رسم الخط کی بنیادی خصوصیات

عربی رسم الخط کی چند خصوصیات اسے دوسرے رسوم سے ممتاز کرتی ہیں۔ اول یہ کہ یہ دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا ہے اور اس کے حروفِ تہجی اٹھائیس ہیں جن میں سے بیشتر الفاظ میں باہم جڑ جاتے ہیں، اسی لیے ہر حرف کی چار صورتیں بنتی ہیں: الگ، لفظ کے شروع میں، درمیان میں اور آخر میں۔ دوم یہ کہ اس میں مختصر حرکتیں یعنی زبر، زیر اور پیش عموماً لکھی نہیں جاتیں اور قاری انہیں نحو و صرف کی معرفت اور سیاق سے سمجھتا ہے، البتہ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیمی کتابوں میں اعراب باقاعدہ لگائے جاتے ہیں۔ سوم یہ کہ بعض حروف جیسے الف، دال، ذال، رے، زے اور واؤ آگے کے حرف سے نہیں جڑتے، اس سے الفاظ کی بصری تقسیم برقرار رہتی ہے۔ چہارم مصحفی رسم میں چند مخصوص املائی قواعد چلے آتے ہیں، مثلاً بعض مقامات پر واؤ یا الف کا زائد لکھا جانا یا تائے مربوطہ اور تائے مفتوحہ کا اختلاف، اور ان قواعد کی پابندی مصاحف کی کتابت میں آج بھی لازم سمجھی جاتی ہے۔ پنجم یہ کہ یہ خط مختصر نویسی اور اختصار کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے، اسی لیے صدیوں تک علم کا عظیم ذخیرہ نسبتاً محدود مسودات میں محفوظ رہا۔

جدول 1: عربی رسم الخط کے مراحل کا خلاصہ

مرحلہ	زمانہ	نمایاں خصوصیت
ابتدائی عربی خط	ظہورِ اسلام اور صدرِ اسلام	نقطوں اور اعراب سے خالی، سادہ شکلیں
رسمِ عثمانی / مصحفی رسم	خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	مصاحف کا سرکاری املا، مخصوص قواعد کا قیام
اعراب و نقطوں کا اضافہ	پہلی صدی ہجری کے اواخر	ابوالاسود دؤلی، نصر بن عاصم؛ لحن سے حفاظت
خطِ کوفی و نسخ کی ترویج	دوسری تا چوتھی صدی ہجری	کوفی تزئینی، نسخ کتابی خط کے طور پر رائج
تناسب یافتہ خطوط	چوتھی صدی ہجری کے بعد	ابن مقلہ و ابن بواب کے قواعد؛ ثلث و دیگر خطوط

حدیث اور علوم اسلامیہ میں رسم الخط کی اہمیت

علم حدیث سے عربی رسم الخط کا گہرا تعلق ہے۔ ابتدائی ادوار میں جب خط نقطوں اور اعراب سے خالی تھا تو احادیث کی حفاظت کا بڑا دارومدار سماع، حفظ اور قابل اعتماد روایت پر تھا، اور املا کی مشابہت سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں ہی کو محدثین کی اصطلاح میں تصحیف و تحریف کہا گیا، جس کی تحقیق ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر گئی۔ محدثین نے ضبط و اتقان کی شرط اسی لیے رکھی کہ کتاب سے نقل ہونے والی روایت رسم الخط کی لغزش سے بچی رہے۔ آج جب کوئی طالب علم قدیم مخطوطات یا مصحفی املا والی عبارات پڑھتا ہے تو اسے ان خصوصیات کو جاننا ضروری ہے، ورنہ وہ لفظ کی صحیح صورت اور قرات میں غلطی کر سکتا ہے۔ غریب الحدیث کے علم میں بھی عربی الفاظ کی املائی صورتوں کی معرفت بنیادی شرط ہے، کیونکہ حدیث کے مشکل الفاظ کی تشریح انہی لکھائی صورتوں سے جڑی ہوتی ہے۔

حاصل کلام

خلاصہ یہ ہے کہ عربی رسم الخط ایک زندہ اور ارتقا پذیر نظام کتابت ہے جو نبطی اثرات سے شروع ہو کر نبوی دور میں وحی کی کتابت سے اوج کو پہنچا، رسم عثمانی کی صورت میں قیامت تک کے لیے ایک محفوظ املا کی بنیاد بنا، پھر اعراب و اعجام کے اضافے سے عالمگیر ہوا اور کوفی و نسخ جیسے خطوط کی صورت میں فن کا درجہ پا گیا۔ قرآن و حدیث کے عظیم ذخیرے کی بقا اسی خط کی مرہونِ منت ہے، اور اس کی اقل ترین خصوصیات سے واقفیت ہر طالب علم علوم اسلامیہ کے لیے ضروری ہے۔

سوال نمبر 2: مشہور عرب ادیب عمرو ابن معدیکرب — تفصیلی نوٹ

سوال نمبر 2: مشہور عرب ادیب: عمرو ابن معدیکرب پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

عرب ادب کی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی ہیں جن کی شہرت بیک وقت تلوار اور قلم، میدانِ کارزار اور محفلِ شعر دونوں سے جڑی ہے؛ عمرو بن معدیکرب زبیدی انہی میں سرِفہرست ہیں۔ وہ دورِ جاہلیت کے آخری اور صدرِ اسلام کے اولین ادوار کو ملا کر دیکھنے والی وہ منفرد شخصیت ہیں جنہیں اصطلاح میں مخضرم یعنی دونوں ادوار کو پانے والا کہا جاتا ہے۔ وہ یمن کے مشہور فارس و شاعر تھے، جن کی بہادری ضرب المثل بنی اور جن کی شاعری عربی حماسی ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس نوٹ میں ان کے نسب و خاندان، ذاتی حالات، اسلام قبول کرنے، جہاد میں حصے، شاعری کی خصوصیات اور ادبی مقام پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے، تاکہ طالب علم کو اس مشہور عرب ادیب کی جامع تصویر مل سکے۔

نام، نسب اور خاندان

ان کا نام عمرو بن معدیکرب بن ربیعہ زبیدی ہے۔ زبید یمن کے مذحج قبیلے کی ایک مشہور شاخ ہے اور معدیکرب ان کے والد کا نام ہے جو خود بھی اہلِ یمن میں شہرت رکھتے تھے۔ عمرو بن معدیکرب اپنی قوم کے سردار، فارس اور شاعر کی حیثیت سے پورے جزیرہ عرب میں مشہور تھے۔ ان کی کنیت اور نسب کے ساتھ زبیدی کی نسبت ان کے یمنی اور مذحجی پس منظر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عربوں میں شجاعت کو شعر کے ساتھ جوڑ کر بیان کرنے کا رواج عام تھا، اور عمرو اس میدان میں اپنی مثال آپ تھے؛ ان کی مشہور تلوار کا نام صمصامہ تھا جو عربی تاریخ و ادب میں ضرب المثل بن گئی اور بعد میں خلفاء کے خزائن میں بھی رہی۔ مورخین نے انہیں عہدِ جاہلیت کے ان نامور فرسان میں شمار کیا ہے جن کی داستانیں مجلسوں میں سنائی جاتی تھیں۔

جوانی، شجاعت اور جاہلی دور کی شہرت

عمرو بن معدیکرب عمر کے لحاظ سے وہ خوش نصیب بلکہ تاریخی اہمیت رکھنے والے شخص ہیں جنہوں نے طویل عمر پائی اور جاہلیت کے پورے ماحول کو بچشمِ خود دیکھا۔ ان کی جوانی قبائلی لڑائیوں اور غزواتِ جاہلیت میں گزری، اور ان کی شجاعت اس حد تک مشہور ہوئی کہ دشمن ان کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ بڑھاپے میں بھی

ان کے ہاتھ کی قوت اور گھوڑے کی سواری برقرار رہی۔ جاہلیت میں شراب اور قبائلی عصبیت اس دور کی عمومی فضا تھی جس سے عمرو بھی اس وقت متاثر رہے، لیکن ان کی طبیعت میں سخاوت، مہمان نوازی اور کلام کی فصاحت جیسے وہ اوصاف بھی تھے جنہیں عرب فضیلت کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انہی اوصاف کے باعث ان کی شخصیت کو بعد کے مورخین نے جاہلیت کے بہترین نمائندہ فرسان میں جگہ دی ہے۔

اسلام قبول کرنا اور نبوی عہد سے تعلق

9 ہجری کے قریب جب عرب قبائل کے وفود مدینہ منورہ آنے لگے تو عمرو بن معدیکرب اپنے قبیلے کے ساتھ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی عملی زندگی میں وہی تبدیلی آئی جو ہر مخلص مسلمان میں آتی ہے؛ انہوں نے اپنی شجاعت کو قبائلی تعصب کے بجائے دین کی خدمت میں صرف کرنا شروع کیا۔ بعض روایات میں اس دور کے بعض واقعات میں اختلاف پایا جاتا ہے جن کی تفصیل مطول کتبِ سیر میں دیکھنی چاہیے، تاہم اس بات پر اہلِ علم متفق ہیں کہ وہ مسلمان ہوئے اور ان کی آخری زندگی اسلام ہی میں گزری۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہونے والی بڑی فتوحات، خصوصاً جنگِ قادسیہ، میں انہوں نے بڑھاپے کے باوجود قابلِ قدر حصہ لیا اور اپنے جوہرِ شجاعت دکھائے۔ مورخین کے بیان کے مطابق ان کا انتقال 21 ہجری کے قریب نہاوند کی جنگ کے زمانے میں ہوا، جبکہ بعض نے اس سے مختلف روایات بھی نقل کی ہیں، اس لیے تاریخِ وفات میں احتیاط کے ساتھ روایات کا یہ دائرہ بیان کرنا ہی علمی امانت ہے۔

عمرو بن معدیکرب کی شاعری

عمرو بن معدیکرب کی شاعری عربی ادب میں حماسہ یعنی جوش و شجاعت کی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ان کے اشعار میں دو جذبے نمایاں ہیں: فخر اور حماسہ۔ وہ اپنے کارناموں، اپنی قوم کی بہادری اور جنگ کی سختیوں کو ایسے پرجوش اور مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا میدانِ جنگ کی تصویر دیکھنے لگے۔ ان کی شاعری کی زبان پر خالص یمنی و بدوی رنگ غالب ہے، الفاظ مضبوط اور قافیے جاندار ہیں۔ ان کے بعض اشعار آج بھی حکم و امثال کا درجہ رکھتے ہیں؛ خصوصاً تدبیر، خودداری اور ناممکن کو چھوڑ کر ممکن کی طرف بڑھنے جیسے مضامین ان کے کلام کی پہچان ہیں، اور عربی زبان کے اہلِ ادب نے ان اشعار کو امثال و حکم کی کتابوں میں بھی جگہ دی ہے۔ ان کے اشعار کا ایک حصہ

ان کے دیوان کی صورت میں محفوظ رہا اور قدیم لغت و ادب کی کتابوں میں ان کے کلام سے شواھد لائے گئے، کیونکہ مخضرم شعراء کا کلام لغوی حجت سمجھا جاتا تھا۔ مقالے اور ادبی تذکرے انہیں جاہلیت و اسلام کے درمیان پل کی حیثیت دیتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی اور ان کا کلام دونوں ادوار کے ادبی مزاج کو یکجا پیش کرتے ہیں۔

ادبی و تاریخی مقام

علمی دنیا میں عمرو بن معدیکرب کا مقام کئی اعتبار سے ممتاز ہے۔ پہلا اعتبار ادبی ہے: ان کا کلام عربی لغت، اسلوب اور حماسی ادب کے مطالعے میں سند کا درجہ رکھتا ہے اور جامعہ جات میں جاہلی ادب کے نصاب میں ان کی شخصیت پڑھائی جاتی ہے۔ دوسرا اعتبار تاریخی ہے: ان کی زندگی پر لکھی گئی روایات سے جاہلیت کے سماجی احوال، قبائلی نظام اور عرب جنگجوؤں کی اخلاقیات پر روشنی پڑتی ہے۔ تیسرا اعتبار تربیتی ہے: ان کی زندگی اس حقیقت کی عملی مثال ہے کہ اسلام نے جاہلیت کی طاقتوں کو مٹایا نہیں بلکہ انہیں درست سمت دے کر امت کی خدمت میں لگا دیا؛ جاہلیت کا فارسِ عرب اسلامی دور میں مجاہدِ اسلام بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو و عربی کے ادب کے نصابوں میں ان پر مستقل اسباق شامل رہے ہیں اور لغت الحدیث و عربی ادب کے طلبہ کے لیے ان کی شخصیت و کلام سے واقفیت مفید قرار پاتی ہے۔

جدول 1: عمرو بن معدیکرب — اہم معلومات کا خلاصہ

تفصیل	پہلو
عمرو بن معدیکرب بن ربیعہ، زبیدی، مذحجی، یمنی	نام و نسب
مخضرم شاعر (جاہلیت و اسلام دونوں ادوار پائے)	ادبی حیثیت
شجاعت و فروسیت اور حماسی شاعری؛ مشہور تلوار صمصامہ	وجہِ شہرت
9 ہجری کے قریب وفد کے ساتھ اسلام قبول کیا	اسلام
فتوحاتِ فاروقی، خصوصاً قادسیہ میں شرکت کی روایات	جہاد میں حصہ

وفات	21 ہجری کے قریب (روایات میں اختلاف ہے)
ادبی ورثہ	دیوانِ شعر، امثال و حکم اور حماسہ کی نمایاں مثالیں

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ عمرو بن معدیکرب عرب تاریخ کی وہ چمکتی ہوئی شخصیت ہیں جو بیک وقت شہسوار، شاعر بھی، سردار بھی اور پھر مومن و مجاہد بھی۔ ان کی زندگی جاہلی عرب کے اقدار و ماحول کی دستاویز ہے اور ان کا کلام عربی حماسی ادب کا روشن باب۔ اس لیے ادبِ عربی کے مطالعے میں ان پر نوٹ لکھنا محض ایک شخصیت کا تعارف نہیں بلکہ دو تہذیبی ادوار کو سمجھنے کی ایک کلید ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ ان کے مختصر سوانحی خاکے کے ساتھ ان کے کلام کی خصوصیات، خصوصاً فخر و حماسہ اور حکم و امثال، کو ذہن نشین کرے۔

سوال نمبر 3: حلاوۃ الایمان سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر 3: حلاوۃ الایمان سے کیا مراد ہے؟ واضح کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

حلاوۃ الایمان یعنی ایمان کی مٹھاس اسلامی روحانیت کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ہے، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مشہور حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین خصلتیں جس شخص میں جمع ہو جائیں وہ ایمان کی مٹھاس کو پا لیتا ہے؛ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ وہ کسی بندے سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے، اور تیسرے یہ کہ وہ کفر کی طرف لوٹنے کو اس طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ موضوع لغت الحدیث میں اس لیے زیرِ بحث آتا ہے کہ لفظ حلاوۃ کا استعمال یہاں اپنے

مادی معنی سے آگے بڑھ کر روحانی کیفیت کے اظہار کے لیے ہوا ہے، اور اس کی درست تفہیم حدیث کی تشریح کی کلید ہے۔ ذیل میں حلاوۃ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم، حدیث کی تین خصلتوں کی وضاحت، شارحین کے اقوال اور اس مفہوم کے عملی اثرات پر کلام کیا جاتا ہے۔

حلاوۃ کے لغوی اور استعاراتی معنی

حلاوۃ عربی زبان میں مٹھاس کو کہتے ہیں، جو حلو یا حلاو سے ماخوذ ہے۔ کھانے کی مٹھاس زبان سے محسوس ہوتی ہے، لیکن ایمان کو مٹھاس سے تشبیہ دینا استعارہ ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح میٹھی چیز طبیعت کو بھاتی ہے اور آدمی اس کی طرف رغبت کرتا ہے، اسی طرح ایمان جب دل میں پختہ ہو جاتا ہے تو عبادت و اطاعت انسان کو بوجھ نہیں لگتی بلکہ اس میں لذت اور سکون محسوس ہونے لگتا ہے۔ شارحین حدیث، خصوصاً امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حلاوۃ الایمان سے مراد طاعتوں میں ذوق پانا، ایمان کی وجہ سے دنیا کی خواہشات کے مقابلے میں دینی مشقتوں کو ترجیح دینا اور اللہ و رسول کی رضا کو ہر رغبت پر مقدم رکھنا ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ ایمان کی دو حالتیں ہیں: ایک رسمی یقین جو صرف اقرار اور معلومات تک محدود ہو، اور دوسری وہ ذوقی کیفیت جس میں ایمان دل کی غذا بن جاتا ہے؛ حلاوۃ اسی دوسری کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت دلیل کے سمجھنے سے نہیں بلکہ عمل، محبت اور اخلاص کی پختگی سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس حدیث کو ایمان کے کمال کا معیار قرار دیا گیا ہے۔

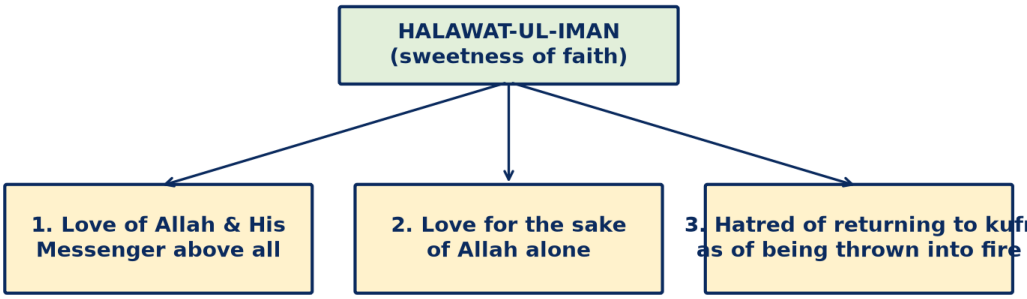

شکل 1: حلاوۃ الایمان کی تین خصلتیں (حدیثِ انس رضی اللہ عنہ)

پہلی خصلت: اللہ اور اس کے رسول کی محبت سب سے بڑھ کر

پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر محبت سے بڑھ جائے: مال، اولاد، خاندان، جاہ و منصب، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی بڑھ کر۔ اس محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کے احکام پر عمل کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کو اپنی پہچان بنائے۔ قرآن مجید میں بھی اہلِ ایمان کی یہی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔ یاد رہے محبت کا مطلب محض زبانی دعویٰ نہیں بلکہ دل کی وہ کیفیت ہے جو عمل پر مجبور کرے؛ جسے میٹھی چیز پسند ہو وہ اسے بار بار چاہتا ہے، اسی طرح جسے اللہ و رسول محبوب ہوں وہ ان کی اطاعت کی طرف بار بار لوٹتا ہے۔ یہی بنیادی خصلت باقی دو خصلتوں کی جڑ ہے، کیونکہ جس کی محبت کا مرکز درست ہو جائے اس کی تمام محبتیں اور نفرتیں اسی مرکز کے گرد منظم ہو جاتی ہیں۔

دوسری خصلت: اللہ کے لیے محبت کرنا

دوسری خصلت یہ ہے کہ بندہ کسی سے محبت کرے تو خالصتاً اللہ کے لیے کرے، نہ دنیاوی فائدے کے لیے، نہ رشتہ داری یا مفاد کے دباؤ میں، بلکہ اس لیے کہ وہ شخص اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے یا اس میں دینی خوبی پائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسی اصول کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کسی سے دوری یا ناپسندیدگی بھی اللہ ہی کے لیے ہو، یعنی گناہ و نافرمانی سے نفرت ہو، نہ کہ ذاتی انا یا حسد کی بنیاد پر۔ علماء نے لکھا ہے کہ محبت فی اللہ قیامت کے دن عرش کے سائے کا سبب بننے والے اعمال میں شمار ہوئی ہے اور یہ مومنوں کے باہمی تعلقات کو خلوص پر استوار کرتی ہے۔ معاشرتی اعتبار سے اس خصلت کا فائدہ یہ ہے کہ دوستی و دشمنی کا معیار ذاتی مفاد کے بجائے حق و تقویٰ بن جاتا ہے، جس سے سماج میں منافقت اور چاپلوسی گھٹتی اور سچائی و ایمانداری بڑھتی ہے۔

تیسری خصلت: کفر کی طرف واپسی سے آگ جیسی نفرت

تیسری خصلت یہ ہے کہ ایمان کی نعمت پانے کے بعد کفر و گمراہی کی طرف لوٹ جانا انسان کو اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں پھینکے جانا ناگوار ہوتا ہے۔ اس تشبیہ میں عظیم حکمت ہے: آگ سے بچنا انسانی فطرت کا فوری ردِ عمل ہے، اسی طرح پختہ ایمان والا کفر و فسق سے فطری اور شدید پرہیز کرتا ہے، اسے کسی وعظ کے دباؤ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ

خصلت ایمان کی حفاظت اور استقامت کی ضمانت ہے؛ جس دل کو گناہ کراہیت محسوس ہو وہ معصیت میں دیر نہیں کرتا اور توبہ کی طرف فوراً لوٹتا ہے۔ یہاں یہ تنبیہ بھی مناسب ہے کہ انفرادی دینی معاملات میں قطعی احکام اور کسی شخص کی دینی حیثیت کے بارے میں فیصلہ اہلِ علم و اہلِ اختیار کا کام ہے؛ عام طالب علم کے لیے اس حدیث کا پیغام اپنی ذات کی اصلاح اور ایمان کی قدر دانی ہے۔

حلاوۃ الایمان کے عملی اثرات و فوائد

جس شخص کو ایمان کی مٹھاس نصیب ہو جاتی ہے اس کی زندگی میں کئی نمایاں تبدیلیاں آتی ہیں۔ نماز و عبادت اس کے لیے روح کی غذا بن جاتی ہے اور وہ عبادت میں خشوع و لذت پاتا ہے۔ آزمائشوں میں صبر اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہر حال کو اللہ کی رضا سے جوڑ دیتا ہے۔ گناہوں سے طبعی نفرت کی وجہ سے اس کی زندگی پاکیزہ رہتی ہے، اور دعا و ذکر میں اسے وہ سکون ملتا ہے جو دنیوی اسباب فراہم نہیں کر سکتے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ حلاوۃ الایمان درحقیقت یقین کے اس درجے کا نام ہے جس میں دل دنیا کے اتار چڑھاؤ سے مطمئن رہتا ہے۔ اس کے حصول کا راستہ بھی وہی ہے جو حدیث نے بتایا: محبتِ الٰہی و محبتِ رسول کی تربیت، محبت کا اللہ کا مزاج اور استقامتِ ایمان؛ ساتھ ہی علماء تلاوت، ذکر، صحبتِ صالحین کی صحبت اور مستقل عمل کو اس کیفیت کے اسباب میں گنتے ہیں۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ حلاوۃ الایمان سے مراد ایمان کی وہ ذوقی اور روحانی کیفیت ہے جس میں اطاعت لذت، محبتِ الٰہی محبتوں کا مرکز اور کفر و معصیت سے نفرت فطرت بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت تین خصلتوں سے حاصل ہوتی ہے جنہیں حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لغت الحدیث کے طالب علم کے لیے اس بحث سے دو سبق ملتے ہیں: ایک یہ کہ حدیث کے الفاظ بسا اوقات استعارے و کنائے میں آتے ہیں اور ان کا درست مفہوم شارحین کی روشنی میں سمجھنا چاہیے؛ دوسرا یہ کہ ایمان کا مقصد محض معلومات نہیں بلکہ دل کی وہ مٹھاس ہے جو پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

سوال نمبر 4: استنجار سے کیا مراد ہے؟ تفصیلی بحث

سوال نمبر 4: استنجار سے کیا مراد ہے؟ تفصیلی بحث کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

استنجار فقہ الطہارۃ اور لغتِ حدیث دونوں کی ایک اہم اصطلاح ہے جو احادیث میں بار بار آئی ہے، خصوصاً ان روایات میں جو قضائے حاجت کے آداب اور صفائی کے احکام بیان کرتی ہیں۔ لفظ استنجار کے لغوی ماخذ، اس کے شرعی مفہوم، اس سے متعلق احادیث، ان کی شرائط و مقدار، اس کے لیے ممنوع اشیاء اور اہل علم کے مذاہب کو سمجھے بغیر ان احادیث کا درست فہم ممکن نہیں۔ لغت الحدیث کا یہی مقصد ہے کہ حدیث میں آنے والے مشکل و غیر معروف الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تحقیق پیش کی جائے تاکہ طالب علم حدیث کے مفہوم تک درست راستے سے پہنچے۔ اس جواب میں استنجار کی تعریف، احادیث کی روشنی میں اس کا حکم و طریقہ، کن چیزوں سے استنجار جائز اور کن سے ممنوع ہے، استنجاء بالماء اور استنجار کا فرق، اور فقہاء کے مذاہب کا خلاصہ علمی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بحث خالص علمی و نصابی ہے؛ عملی دینی فتوے اور انفرادی مسائل کے لیے مستند مفتیان و علماء سے رجوع کرنا ہی درست روش ہے۔

استنجار کے لغوی اور اصطلاحی معنی

استنجار عربی لفظ ہے جو جمرہ سے ماخوذ ہے؛ جمرہ یا جمار چھوٹے پتھروں کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے حج میں رمی کے کنکروں کو بھی جمرات کہا جاتا ہے۔ بابِ استفعال سے استنجار کا معنی ہے پتھروں کو استعمال کرنا یا پتھروں سے کام لینا۔ فقہی اصطلاح میں استنجار سے مراد قضائے حاجت کے بعد نکلنے والی نجاست کو خشک چیز، خصوصاً پتھر وغیرہ سے پونچھ کر صاف کرنا ہے، بشرطیکہ وہ چیز صاف کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اسی سے ملتا جلتا لفظ استطابہ بھی ہے جو عام مفہوم میں طہارت حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ جہاں استنجاء بطور خاص پانی سے دھونے کو کہا جاتا ہے، وہیں استنجار خشک اشیاء سے پونچھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر کتب میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے عام مفہوم میں بھی

استعمال ہو جاتے ہیں۔ اس اصطلاحی فرق کو جاننا حدیث کی عبارت سمجھنے کے لیے ضروری ہے، ورنہ قاری استجمار والی احادیث کو پانی والے احکام پر محمول کر کے التباس میں پڑ سکتا ہے۔

استجمار سے متعلق اہم احادیث

احادیث میں استجمار کا ذکر واضح طور پر آیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمایا کہ ہم قضائے حاجت کے وقت قبلے کی طرف رخ کریں، اور یہ بھی کہ ہم تین پتھروں سے کم پر استجمار کریں، اور یہ کہ ہم گوبر یا ہڈی سے استجمار کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص استجمار کرے وہ وتر کی طاق عدد اختیار کرے، یعنی تین، پانچ یا سات مرتبہ پونچھے۔ علماء نے اس حکم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ طاق عدد میں پورے محل کی صفائی کا زیادہ احتمال رہتا ہے اور یہ سنتِ نبوی کی عمومی محبت وتر کی جھلک بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استجمار کی اشیاء پیش کی گئیں تو آپ نے ہڈی اور گوبر واپس کر دیے اور پتھر قبول فرمائے، اور ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں تمہارے بھائی جنات کی غذا ہیں۔ ان احادیث سے استجمار کا ثبوت، اس کی کم از کم مقدار اور ممنوع اشیاء، تینوں چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔

استجمار کی شرائط اور مقدار

فقہاء نے احادیث کی روشنی میں استجمار کے چند شرائط بیان کیے ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ جس چیز سے استجمار کیا جائے وہ پاک اور صاف کرنے والی ہو، یعنی نجاست کو ہٹانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ دوسری شرط یہ کہ وہ کم از کم تین پونچھے (مسحات) ہوں؛ اگر تین سے کم میں صفائی مکمل نہ ہو تو زیادہ پونچھا جائے اور طاق عدد رکھا جائے۔ تیسری شرط یہ کہ نجاست اپنے مخرج کی حدود سے تجاوز کر کے اطراف میں دور تک نہ پھیلی ہو؛ اگر نجاست مقررہ حد سے آگے پھیل جائے تو پھر پانی سے دھونا ضروری قرار پاتا ہے، کیونکہ خشک پونچھنا اس صورت میں کافی نہیں ہوتا۔ جہاں تک شمار کا تعلق ہے تو تین پتھر ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک ہی پتھر کے تین کناروں سے بھی تین مسحات کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے،

کیونکہ اصل مقصد صفائی اور انتہائی نجاست کا ازالہ ہے۔ بعض فقہاء نے تین مسحات کے حصول کو ہی کافی شمار کیا اور بعض نے مزید احتیاط کی تاکید کی۔ ان تمام فقہی تدقیقات سے اہلِ علم کے ہاں اصل اصول یہ مستحضر رہتا ہے کہ شریعت کا مقصود حقیقی طہارت ہے نہ کہ محض عدد کی رسم۔

ممنوع اشیاء: ہڈی، گوبر وغیرہ

حدیث نے دو چیزوں سے صاف منع کیا ہے: ہڈی اور گوبر۔ ہڈی کے بارے میں وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ جنات کی غذا ہے، اور گوبر کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ ان کے جانوروں کا چارا ہے، اس لیے ان میں آلودگی بھی ہے اور صفائی کی صلاحیت بھی مشکوک ہے۔ ان دو کے قیاس پر فقہاء نے چند اور چیزوں سے بھی استجمار ممنوع یا ناجائز قرار دیا: کھانے کی اشیاء، کیونکہ نعمت کی توہین ہے؛ وہ اشیاء جن کی قیمت و احترام ہے مثلاً ریشم یا لکھی ہوئی ورق، دینی کتابوں والی چیزوں کی ممانعت تو بدیہی ہے؛ ایسی چیزیں جو نجاست کو پھیلائیں یا جسم کو نقصان پہنچائیں، جیسے کوئی تیز دھار یا شیشہ؛ اور دائیں ہاتھ سے استجمار کی بھی ممانعت حدیث میں آئی ہے، کیونکہ دایاں ہاتھ کھانے پینے کے لیے مخصوص ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت کے وقت قبلہ رخ ہونے اور دایاں ہاتھ استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ عصر حاضر میں فی زمانہ ماہرین صحت کی ہدایات کے پیش نظر پانی کی فراوانی میں پانی سے استنجاء کو ترجیح دینا عین صحت و صفائی کے موافق ہے، اور جہاں پانی میسر نہ ہو وہاں یہ سنتِ طریقہ شریعت کی سہولت کا خوبصورت نمونہ ہے۔

جدول 1: استجمار و استنجاء کا فرق اور احکام

پہلو	استجمار	استنجاء بالماء
وسیلہ	خشک پاک چیز: پتھر، ڈھیلے، کاغذ (ٹشو) وغیرہ	پانی سے دھو کر صاف کرنا
مقدار	کم از کم تین مسحات، وتر کی ترغیب	حتیٰ کہ نجاست کا اثر زائل ہو جائے
ممنوعات	ہڈی، گوبر، ناپاک و مُضر اشیاء	کھڑا یا نجس پانی، دایاں ہاتھ
ترجیح	پانی نہ ہونے یا ضرورت کی صورت میں معتبر	پانی کی موجودگی میں افضل و کامل طہارت

مقصد	محل کی صفائی و نجاست کا ازالہ	محل کی مکمل تطہیر

فقہاء کے مذاہب کا خلاصہ

استجمار کی مشروعیت پر ائمہ کا اتفاق ہے، اختلاف اس کی حد کفایت کی حدود میں ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک جب نجاست مخرج سے آگے نہ بڑھی ہو تو استجمار سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے اور نماز ادا ہو سکتی ہے، البتہ پانی سے استنجاء کرنا افضل اور اعم ہے۔ بعض علماء نے ہر حال میں پانی کو ترجیح دی اور خشک صفائی کو بوقتِ ضرورت کی اجازت کہا، جبکہ فقہاء کی ایک جماعت نے استجمار کو مستقل سنت طریقہ قرار دیتے ہوئے پانی کے ساتھ اس کے جمع کرنے کو مکمل قرار دیا۔ جدید دور میں ٹشو پیپر وغیرہ خشک صفائی کی اشیاء اسی باب میں فقیہانہ قیاس سے شامل کی گئی ہیں، بہر حال عصر حاضر میں عام حالات میں پانی کا استعمال ہی راجح اور بہترین عمل ہے۔ ان فقہی آرا کو نصاب میں تعلیمی غرض سے بیان کیا جاتا ہے؛ کسی عملی صورت کے شرعی حکم کے لیے اہل علم سے رجوع ہی درست طرز ہے۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ استجمار سے مراد قضائے حاجت کے بعد پاک خشک چیز، خصوصاً پتھر، سے کم از کم تین بار پونچھ کر نجاست صاف کرنا ہے۔ یہ عمل نصوص سے ثابت، سفر و حضر کی سہولت کا ذریعہ اور طہارت کے اسلامی نظام کا حصہ ہے۔ اس کے لیے ہڈی، گوبر اور ضرر رساں یا مقدس اشیاء کا استعمال ممنوع ہے، اور پانی میسر ہو تو اس سے طہارت اکمل ہے۔ لغت الحدیث کا طالب علم اس اصطلاح کو سیکھ کر ان احادیث کو درست سمجھ سکتا ہے جن میں طہارت کے آداب بیان ہوئے ہیں۔

سوال نمبر 5: انشاء السلام کے معنی — جامع کلام

سوال نمبر 5: انشاء السلام کے کیا معنی ہیں؟ جامع انداز میں کلام کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

افشاء السلام اسلام کے معاشرتی نظام کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے، جو کئی مشہور احادیث میں اس تاکید کے ساتھ آئی ہے کہ اسے جنت میں داخلے اور ایمان کی تکمیل سے جوڑ دیا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلانا اور سلام کہنا، خواہ پہچان ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح صحیح مسلم کی حدیث میں فرمایا گیا کہ تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور ایمان نہیں لا سکتے یہاں تک کہ آپس میں محبت نہ کرو؛ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتاؤں جس پر عمل کرنے سے آپس میں محبت پیدا ہو جائے: اپنے درمیان سلام کو پھیلاؤ۔ لغت الحدیث کے تناظر میں افشاء السلام کے سارے پہلو سمجھنا ضروری ہے: لغوی معنی، اصطلاحی مفہوم، احادیث کی روشنی میں اس کی فضیلت، اس کے آداب اور اس کے معاشرتی اثرات۔ ذیل میں اسی جامع ترتیب سے کلام کیا جاتا ہے۔

افشاء السلام کے لغوی اور اصطلاحی معنی

افشاء عربی بابِ افعال کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا، پھیلانا اور عام کرنا۔ سلام کے معنی امن، سلامتی اور ہر برائی سے برأت کے ہیں، اور السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام بھی ہے۔ السلام علیکم کا مفہوم یہ دعا ہے کہ آپ اللہ کی حفاظت، اس کی رحمت اور ہر آفت سے سلامتی میں رہیں۔ پس افشاء السلام سے مراد ہے سلام کو معاشرے میں عام کرنا، آواز سے اور اہتمام سے سلام کہنا، پہچان اور اجنبیت کے فرق ختم کر کے ہر مسلمان کو سلام کی دعا دینا، اور یوں سلام کو معاشرے کا معمول اور امن کی علامت بنا دینا۔ اس کے برعکس سلام میں بخل کرنا یا صرف خاص واقفوں تک اسے محدود کر دینا حدیث کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں؛ بخل کی سب سے بری صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ آدمی سلام کہنے میں بھی بخل کرے۔ یوں اس اصطلاح کا دائرہ محض ایک فقرہ بولنے تک محدود نہیں بلکہ یہ امن و محبت پر قائم معاشرتی تہذیب کا مکمل عنوان ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں سلام کا حکم واہتمام

قرآن مجید میں سلام کی متعدد جہات بیان ہوئی ہیں: اہل جنت کا تحیہ سلام ہوگا، فرشتے مومنین کو سلامتی کی بشارت دیں گے، گھروں میں داخلے پر اہلِ خانہ کو سلام کرنے کا حکم دیا گیا اور جب سلام کیا جائے تو اس سے بہتر یا کم از کم ویسا ہی جواب دینے کی ہدایت کی گئی۔ احادیث میں سلام کو اسلام کے حقوق میں شمار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر حقوق میں سے ایک یہ کہ جب ملے تو سلام کہے۔ سلام کہنے والوں کی درجات بندی بھی بیان ہوئی ہے: سوار پیدل کو، چلنے والا بیٹھے کو اور کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں سلام کو ان اعمال میں گنا گیا ہے جو اہل ایمان کو سب سے پہلے جنت کے لائق بناتے ہیں، اور یہ خوشخبری دی گئی کہ اس عمل میں سبقت کرنے والا اللہ کا مقرب ہوتا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت میں سلام کے الفاظ بڑھانے پر دس، بیس اور تیس نیکیوں کی تفصیل آئی ہے، یعنی السلام علیکم، پھر ورحمۃ اللہ، پھر وبرکاتہ شامل کرنے سے اجر بڑھتا جاتا ہے۔ ان نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ سلام محض رسم نہیں بلکہ عبادت، دعا اور نیکیوں کا ذریعہ ہے۔

افشاء السلام کی فضیلت و حکمتیں

علماء نے افشاء السلام کی فضیلت کی کئی حکمتیں بیان کی ہیں۔ سب سے بڑی حکمت یہ کہ سلام دلوں میں محبت پیدا کرتا ہے اور عداوت و کینہ ختم کرتا ہے، اسی لیے اسے جنت کی کنجیوں میں سے بتایا گیا۔ دوسری حکمت یہ کہ سلام ہر مسلمان کے لیے یکساں امن کا اعلان ہے، اس سے معاشرے میں اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے اور اجنبی بھی اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ تیسری یہ کہ سلام اللہ کے نام مبارک کا ذکر ہے جو ماحول کو رحمت سے بھر دیتا ہے۔ چوتھی یہ کہ سلام کے عام ہونے سے تکبر ختم ہوتا ہے، کیونکہ چھوٹا بڑے کو اور بڑا چھوٹے کو جب پہل کرتا ہے تو عاجزی پیدا ہوتی ہے، اور حدیث نے بتایا کہ سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے۔ ان حکمتوں کی بنا پر شارحین نے افشاء السلام کو اسبابِ محبت و اصلاحِ معاشرہ میں مرکزی عمل قرار دیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ دلوں کو جوڑنے میں سلام جیسی آسان عبادت کی مثال کم ملتی ہے۔

سلام کے آداب

سلام کے چند آداب احادیث وفقہ کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے: سلام کرنے میں پہل کرنا بہتر ہے، جواب کم از کم ویسا ہی یا اس سے بڑھ کر دینا واجب کے درجے میں آتا ہے؛ سلام صاف آواز سے کہا جائے تاکہ سننے والا سن سکے، لیکن بھیڑ کی جگہ یا سوئے ہوئے کی موجودگی میں آہستگی بھی آداب میں ہے؛ سلام کا اصل لفظی جواب دینا چاہیے، اشارہ اس وقت کافی ہو سکتا ہے جب نماز جیسی مصروفیت ہو؛ بعض سلام کا جواب اشارے سے دیا گیا ہے؛ غیر مناسب مقامات میں مثلاً قضائے حاجت یا اذان کے درمیان میں سلام کی ممانعت یا کراہت علماء نے لکھی ہے؛ سلام میں ہاتھ ملانا ملاقات کی تکمیل میں سنت سے ثابت ہے اور صلح و رضامندی کی صورت میں مصافحہ گناہوں کی مغفرت کا سبب بتایا گیا۔ یہ آداب ظاہر کرتے ہیں کہ افشاء السلام ایک سوچا سمجھا عبادتی عمل ہے جس کا باشائستہ نظام ہے۔

جدول 1: سلام کے آداب کا خلاصہ

ادب	تفصیل
پہل	ملنے والا پہلے سلام کہے؛ پہل کرنے والا تکبر سے بری اور اللہ کا مقرب
جواب	سلام کا جواب اتنا یا اس سے بہتر دینا (وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)
درجات	سوار پیدل کو، چلتا بیٹھے کو، کم تعداد والے بڑی تعداد کو سلام کریں
الفاظ کی تکمیل	ورحمۃ اللہ اور وبرکاتہ بڑھانے سے نیکیاں بڑھتی ہیں (10، 20، 30)
پھیلاؤ	پہچان و اجنبی سب کو سلام کرنا؛ سلام میں بخل کی مذمت
تکمیلِ ملاقات	مصافحہ یعنی ہاتھ ملانا ملاقات کی برکت اور مغفرت کا سبب

معاشرتی اثرات اور موجودہ دور میں اطلاق

افشاء السلام کے معاشرتی اثرات آج بھی اتنے ہی حقیقی ہیں جتنے صدرِ اسلام میں تھے۔ جہاں سلام عام ہو وہاں روزمرہ کے تنازعات کم ہوتے ہیں، محلے اور ادارے میں امن و اعتماد کا ماحول بنتا ہے، اور لوگوں کے دلوں کی دوریاں ختم ہوتی ہیں۔ جدید سماجی نفسیات بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ادب سے سلام و تحیہ تعلقات میں گرمجوشی اور سماجی رابطے کی مضبوطی کا ذریعہ ہے۔ مسلمان طالب علم کے لیے اس حدیث کا عملی پیغام یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، محلے، درس گاہ اور مجلس میں سلام کی پہل کو معمول بنائے، بچوں کو سلام کی عادت ڈالے اور سلام کو رسم کے بجائے دعا سمجھ کر کہے۔ اللہ کے نام سے شروع ہونے والی یہ عاجز روز انسانوں کے درمیان دہرائی جاتی ہے تو پورا ماحول اس کی برکت سے معطر ہو جاتا ہے، یہی افشاء السلام کا اصل مقصد ہے۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ افشاء السلام سے مراد سلام کو معاشرے میں عام کرنا، ہر ملنے والے کو خواہ پہچانی ہو یا اجنبی سلام کی دعا دینا اور اس عمل سے محبت و امن کی فضا پیدا کرنا ہے۔ یہ عمل جنت کا راستہ، ایمان کی تکمیل کا ذریعہ اور باہمی محبت کی ضمانت ہے۔ اس کے آداب کی رعایت کے ساتھ اسے اپنی زندگی کا معمول بنانا ہر طالب علم کی دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے، تاکہ سلام محض الفاظ نہ رہے بلکہ اسلامی معاشرے کی پہچان بن جائے۔